ڈاکٹر رشید احمد جالندھری

دار العلوم دیوبند کا تاریخی پس منظر --- اور
نصاب تعلیم کا مرحلہ وار جائزہ

برطانوی ہندوستان میں مسلم جماعت نے، اہل سنت ہوں یا اثنا عشری، اپنے مذہبی مدارس میں ایک حد تک ایک ہی نصاب تعلیم کو اپنایا، مثلاً سنی اور شیعہ مدارس میں عربی ادب، عربی گرامر (صرف ونحو) فلسفہ ومنطق کا نصاب تقریباً ایک ہی تھا۔ البتہ حدیث اور اصول فقہ میں نصاب تعلیم ایک نہیں تھا۔ اثنا عشری مدارس میں حدیث کی وہ کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، جن کی روایات براہ راست فاطمی ائمہ کرام سے روایت کی جاتی ہیں، البتہ سنی مدارس میں، خواہ ان کا تعلق بریلوی مکتب فکر سے ہو یا دیوبندی نقطہ نظر سے، دونوں جگہ حدیث سے متعلق کتابیں ایک ہی تھیں۔ مثلاً صحاح ستہ (صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابو داؤد، سنن ابن ماجہ، نسائی اور صحیح ترمذی) یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ برطانوی ہندوستان میں مسلمانوں نے اپنی مذہبی روایات اور ملی تشخص کو بچانے کے لیے جو تعلیمی ادارے قائم کیے، ان میں سے ایک دار العلوم دیوبند بھی ہے۔ دیوبند کی اس مذہبی درس گاہ نے برصغیر میں مسلمانوں کی مذہبی اور اجتماعی زندگی میں ایک نمایاں کردار ادا کیا ہے، جس سے تاریخ ہند کا کوئی سنجیدہ طالب علم تغافل نہیں برت سکتا، اور مسلمانوں کی مذہبی زندگی کا کوئی تذکرہ خالی نہیں رہ سکتا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں۔

دار العلوم نے مسلمانوں کی مذہبی زندگی پر گہری چھاپ لگائی ہے، اس کا جائز تقاضا تھا کہ اہل تحقیق دار العلوم کو اپنا موضوع بناتے اور دیکھتے کہ دار العلوم نے کس حد تک مثبت یا منفی کردار ادا کیا ہے۔ یہ تنقیدی جائزہ خود دار العلوم کے لیے بھی بے حد سودمند ہوتا اور وہ اپنا محاسبہ کرنے کے بعد ایک نئے عزم کے ساتھ آگے بڑھتا۔ افسوس کہ دار العلوم نے بھی کوئی ایسی کتاب مرتب نہیں کی جو تاریخ نویسی کے تقاضوں کو پورا کرتی ہو اور نقد وتبصرہ کے ان پیمانوں پر بھی پوری اترتی ہو جنہیں تاریخ نے حقائق کی چھان بین کے لیے وضع کر رکھا ہے، نیز یہ کہ وہ مسلمانوں کے نظام تعلیم یا ارتقاء اور انحطاط پر بھی بحث کرتی اور ان

اسباب کا سراغ لگاتی جنہوں نے مسلمانوں کو ان کی علمی بلندیوں سے اٹھا کر جہالت کی پستیوں میں پھینک دیا ہے۔ ضیاء الحسن فاروقی کی کتاب "دار العلوم" پہلی کامیاب ناقدانہ کوشش ہے، اگر اس کا نقش ثانی تیار ہو جاتا تو یقیناً یہ کتاب دار العلوم پر ایک مستند ماخذ شمار ہوتی۔ (۱)

دیوبند ضلع سہارن پور کی ایک تاریخی بستی ہے جو سہارن پور سے ۲۲ میل اور دہلی سے ۹۰ میل کے فاصلہ پر گنگا اور جمنا کے مابین دو آبہ میں واقع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پانڈوؤں نے اپنی جلا وطنی کے دنوں میں یہاں پر قیام کیا تھا۔ اس شہر کے نام سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوؤں کی مقدس جگہ رہی ہے۔ یہاں سندر دیوی کا مندر ہے جہاں آج بھی چیت کے مہینے میں سالانہ میلہ لگتا ہے۔ شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ دیوبند، دیوی اور بند (سندر دیوی کا قلعہ) سے مرکب ہے، جو مرور زمانہ سے دیوبند بن گیا۔ مسلمانوں کا بھی اس شہر سے پرانا تعلق ہے۔ سکندر لودھی نے ۱۵۰۷ء میں یہاں جامع مسجد بنوائی تھی، ایسے ہی اورنگ زیب نے ۱۶۶۴ء میں یہاں ایک مسجد بنوائی۔ ابو الفضل نے آئین اکبری میں دیوبند میں قلعہ کا تذکرہ کیا ہے۔ (۲) موجودہ وقت میں قصبہ کی آبادی تقریباً پچاس ہزار کے قریب ہوگی، کیونکہ ۱۹۵۱ء میں مردم شماری کے مطابق قصبہ کی آبادی ۲۵،۸۷۲ افراد پر مشتمل تھی جن میں ۱۵،۴۳۴ مسلمان تھے۔

قصبہ کو اس طرح سے بسایا گیا ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی آبادی الگ الگ ہے۔ ہندوؤں کے محلے میں مسلمانوں کی اور مسلمان محلوں میں ہندوؤں کی آبادی بہت کم ہے۔ ۱۷۵۸ء کے ہنگامے کے بعد یہاں کے ایک خدا رسیدہ بزرگ حاجی محمد عابد (وفات ۱۹۱۲ء) نے شہر کے اہل علم سے مشورہ کیا اور کہا "علم دین اٹھا جاتا ہے، کوئی تدبیر کرو کہ علم دین باقی رہے۔ جب عالم نہیں رہیں گے، کوئی مسئلہ بتانے والا بھی نہ رہے گا۔ جب سے دہلی کا مدرسہ گم ہوا ہے، کوئی علم دین نہیں پڑھتا" (۳) سب نے اس مشورہ کو قبول کیا اور حاجی صاحب نے پہل کر کے اپنی طرف سے چندہ دیا، اور پھر چندہ جمع کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چونکہ سید محمد عابد، جو سید عابد حسین کے نام سے بھی معروف ہیں، شہر میں اپنی بزرگی وپارسائی میں معروف ومحبوب تھے اس لیے ہر شخص نے چندہ دینے میں اعزاز جانا، تھوڑی ہی دیر میں چار سو روپے اکٹھے ہو گئے، جس پر انہوں نے میرٹھ میں مقیم مولانا محمد قاسم کو لکھا کہ آپ پڑھانے کے لیے دیوبند تشریف لائیں۔ مولانا محمد قاسم نے جواب میں لکھا:

"میں بہت خوش ہوا' خدا بہتر کرے' مولوی ملا محمود صاحب (وفات ۱۸۸۶ء) کو پندرہ روپے ماہوار مقرر کر کے بھیجتا ہوں' وہ پڑھا دیں گے' اور مدرسہ مذکورہ میں ساعی رہوں گا۔" (۴)

چنانچہ محمود صاحب نے ۱۵ر محرم ۱۲۸۳ھ (۳۰ مئی ۱۸۶۶ء) کو شہر کی ایک قدیم مسجد پختہ میں درس دینا شروع کر دیا۔ اتفاق سے پہلے طالب علم کا نام بھی محمود ہی تھا' جو آگے چل کر مذہبی حلقوں میں شیخ الہند (وفات ۱۹۲۰ء) کے نام سے مشہور ہوئے۔ پہلا درس مسجد میں انار کے درخت کے نیچے دیا گیا۔ حاجی صاحب کے خط سے پتہ چلتا ہے کہ دلی کی بربادی کے بعد دیوبند میں مدرسہ کا قیام مسلمانوں کی دینی خدمت کے لیے ضروری تھا' نیز یہ کہ پرانے علماء کی' جو دنیا سے جا رہے تھے' جگہ کو پر کرنے کا یہی ایک معقول طریقہ تھا' تاکہ مذہبی احکام کی نشر واشاعت کا کام برابر جاری رہے۔ اس خط سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ مدرسے کے قیام میں سب سے پہلا قدم حاجی صاحب نے اٹھایا اور مولانا محمد قاسم اس وقت میرٹھ میں قیام پذیر تھے۔ اگر حاجی صاحب یہ قدم نہ اٹھاتے تو خدا جانے کب تک یہ تجویز تخیل کی دنیا میں پڑی رہتی۔ البتہ یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ مدرسہ کے علمی اور بنیادی مقصد کو بروئے کار لانے کی صلاحیت مولانا قاسم رکھتے تھے۔ اس لیے ان سے رجوع کیا گیا' اور انہوں نے بھی فوراً اثبات میں جواب دیا۔ چونکہ معاملہ باہمی اعتماد' اخلاص اور دینی خدمت کا تھا' اس لیے انتظام وانصرام سے متعلق باتوں پر وقت ضائع نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ہر ایک آدمی نے اپنے مزاج کے مطابق اپنی ذمہ داریوں کو سنبھالا' انتظامی اور مالیاتی امور کے نگران حاجی صاحب قرار پائے' کیونکہ وہی مدرسہ کے بانی تھے' انہوں نے مدرسہ کی مجلس شوریٰ قائم کی' جس میں مولانا محمد قاسم' مولانا فضل الرحمٰن' مولانا ذو الفقار علی' مولوی مہتاب علی اور منشی فضل الحق رکن قرار پائے۔ حاجی صاحب نے شوریٰ کے سرپرست اور مہتمم مدرسہ کی حیثیت سے کوئی تنخواہ نہیں لی۔ مدرسہ کی پہلے سال کی سالانہ روئیداد میں جن لوگوں کے نام "نام مہتممان" کے عنوان سے دیے گئے ہیں' وہ یہ ہیں: ۱۔ حاجی عابد حسین' مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی' مولوی مہتاب علی صاحب' مولوی ذو الفقار علی صاحب' مولوی فضل الرحمٰن صاحب' منشی فضل حق' شیخ نہال احمد۔ مولوی ذو الفقار علی اور مولوی فضل الرحمٰن' انگریزی حکومت کے ملازم رہ چکے تھے

مدرسہ کا قیام اپنی نوعیت کے اعتبار سے کوئی ایسا واقعہ نہیں تھا جسے وقت کا کوئی انقلابی قدم قرار دیا جائے کیونکہ اسلامی تعلیم کے لیے مدرسہ کا قیام کوئی انوکھا تجربہ نہیں تھا' اس

قسم کے مدارس فرنگی محل، لکھنؤ اور دہلی میں موجود تھے، جن کا تعلیمی نصاب درس نظامی تھا اور یہی درس نظامی اس جدید مدرسہ میں بھی اختیار کیا گیا، البتہ یہ جدید مدرسہ اپنی دو ایک باتوں میں وقت کی دوسری درسگاہوں سے ممتاز تھا:

(۱) مدرسہ کے بانیوں نے انگریزی علوم کی مخالفت کی اور نہ ہی اس کی پرزور تائید، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ انہوں نے جدید علوم کی طرف ذہنی رجحان رکھنے کے باوجود غیر جانبدارانہ موقف اختیار کیا۔ ہرچند وہ شاہ عبد العزیز کی اس رائے سے اتفاق رکھتے تھے کہ انگریزی زبان پڑھنا جائز ہے، ان کی اپنی توجہ مسلمانوں کے قدیم ورثہ پر مرکوز رہی، اور ان کی ساری توانائیاں اپنے نصب العین کے حصول کے لیے وقف ہو کر رہ گئیں۔ وہ جدید اور قدیم علم کو اپنے ساتھ لے کر چلنے کو اپنے بنیادی مقصد کے لیے نقصان دہ جانتے تھے۔ مولانا محمد قاسم نے مدرسہ کی ایک سالانہ تقریب (۱۹ ذی قعد ۱۲۹۰ھ، ۹ جنوری ۱۸۷۴ء) میں جدید علوم کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا:

> "اہل عقل پر روشن ہے کہ آج کل تعلیم علوم جدیدہ تو بوجہ کثرت مدارس سرکاری اس ترقی پر ہے کہ علوم قدیمہ کو سلاطین زمانہ سابق میں بھی یہ ترقی نہ ہوئی ہوگی۔ ایسے وقت میں رعایا کو مدارس علوم جدیدہ کا بنانا تحصیل حاصل نظر آیا۔"

اس تقریر سے صاف عیاں ہے کہ مولانا اور ان کے ساتھی علوم جدیدہ کے خلاف نہیں تھے، البتہ انہوں نے علوم جدیدہ کو اپنے نصاب تعلیم کا حصہ نہیں بنایا، اس کی ایک وجہ تو یہ نظر آتی ہے کہ مولانا اور ان کے ساتھی یورپ کی نئی سیاسی طاقت، تمدن اور فلسفہ تعلیم سے، جنہوں نے کہ صدیوں پرانی علمی بساط کو لپیٹ کر رکھ دیا تھا، جمال الدین افغانی جیسی آگہی نہیں رکھتے تھے۔ البتہ وہ نئی تہذیب کو مسلم عقائد، مذہبی روایات اور انداز فکر کا حریف جانتے تھے۔ اس احساس نے ان کے سامنے قدامت پسندی کی راہ کھولی تھی، جس پر چل کر مسلمان اپنی مذہبی روایات کو بچا سکتے تھے۔ البتہ ان کی یہ بھی رائے تھی کہ مدرسہ میں پرانے علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کی تدریس طالب علموں کے لیے بوجھ اور مشکلات کا باعث بن سکتی ہے۔ چنانچہ مولانا نے اپنی اسی تقریر میں فرمایا "زمانہ واحد میں علوم کثیرہ کی تحصیل سب علوم کے حق میں باعث نقصان استعداد رہتی ہے"

بے شبہ مولانا کی زندگی میں مدرسہ کے نصاب تعلیم میں نئے علوم کو جگہ نہیں ملی، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار مشکل ہے کہ مولانا اور دوسرے سنجیدہ علماء نے نئے علوم کی مخالفت نہیں کی، اس لیے کہ دوسری قوموں کے علوم وفنون اور زبانوں کو سیکھنا علمائے حق کا

ہمیشہ سے شعار رہا ہے۔ البتہ ان کی نگہ بصیرت جدید تہذیب وثقافت کی روح کو بھی بے نقاب دیکھ رہی تھی۔ یہ روح، جسے روح الحاد سے تعبیر کرنا مبالغہ نہ ہوگا، غرضیکہ علماء نے جدید علوم کی حیثیت سے مخالفت نہیں کی۔ جدید علوم کے بارے میں بانیان دیوبند کا معاندانہ رویہ اختیار نہ کرنا ایک صحت مند قدم تھا، جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ گزشتہ صدی کی مذہبی اور علمی زندگی کی ابتری کو سامنے رکھ کر ہی لگایا جا سکتا ہے۔

(۲) مدرسہ دیوبند کی دوسری امتیازی خصوصیت جو اسے اپنے معاصر یا پیش رو درس گاہوں سے ممتاز کرتی ہے، یہ ہے کہ اس کا انحصار خدا اور عوام پر تھا۔ وہ سرکاری اثر ونفوذ سے یک قلم آزاد رہا۔ اس نے اپنے بقاء کے لیے نہ صرف سرکاری امداد پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ اس امداد کو اپنے مقصد کے لیے نقصان دہ خیال کیا۔ مولانا محمد قاسم نے مدرسہ کے آٹھ بنیادی اصولوں کے ضمن میں کہا ہے:

"سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں مدرسہ کا سب سے قیمتی سرمایہ رجوع الی اللہ ہے۔ اس تعلق کو ہر صورت میں باقی رہنا چاہیے۔ جس دن یہ رشتہ ٹوٹ گیا اور مادی سہاروں مثلاً جاگیر یا کارخانہ یا تجارت پر اعتماد کیا گیا، اس دن مدرسہ کا مشن ختم ہو جائے گا۔ نیز یہ کہ اسے عوام کی امداد پر بھروسہ کرنا چاہیے جو نام ونمود سے الگ رہ کر چندہ دیتے ہیں۔" (۵)

مدرسہ کی پالیسی کا یہی بنیادی پتھر تھا، جس نے آگے چل کر بیسویں صدی کے پہلے نصف حصہ میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اس پالیسی نے یہ بھی بتا دیا کہ مسلمانوں کی دینی وعلمی قیادت عوام پر پورا اعتماد کر سکتی ہے جو اپنے مذہبی تشخص کے بچاؤ کے لیے پورا شعور رکھتے ہیں۔ اگر مدرسہ کے معاصر جدید علمی ادارے بھی جو جدید تعلیم کے نقیب تھے، اس موقف کو اختیار کرتے اور عوام کو ساتھ لے کر اپنی منزل کی طرف بڑھتے، تو وہ علمی میدان میں مثبت اور صحت مند کردار ادا کر سکتے تھے اور ان ٹھوکروں سے بچ سکتے تھے، جو خود اعتمادی کے فقدان کی وجہ سے انہیں قدم قدم پر کھانا پڑیں۔ اسی امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر اقبالؒ نے اپنے ایک مکتوب بنام سید سلمان ندوی کہا تھا: "گزشتہ پانچ سال کے تجربہ نے مجھے بے حد افسردہ کر دیا ہے۔ مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ انتہائی پست فطرت ہے۔"

مدرسہ دیوبند کی اس آزاد پالیسی کا اعتراف خود اس کے معاصرین نے بھی کیا۔ مولانا شبلی مرحوم نے ندوۃ العلماء کے ایک سالانہ اجلاس میں کہا تھا:

"عربی کے جو بیسیوں مدرسے کان پور میں قائم ہیں، وہ کس نے قائم کیے ہیں؟

سوداگروں نے، دنیا داروں نے .... کسی عالم نے نہیں قائم کیے سوائے مدرسہ دیوبند کے جس پر ہم فخر کرتے ہیں، جو کہ مولانا قاسم مرحوم نے قائم کیا تھا۔ علاوہ اس کے مدرسہ کسی عالم نے قائم نہیں کیا۔" (۶)

مدرسہ کی عمارت

جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ مدرسہ کی ابتدا پختہ مسجد میں ہوئی، جب طالب علموں کی تعداد بڑھی تو قاضی مسجد اور کرایہ کے مکانات میں درس دیا جانے لگا۔ شہر کی جامع مسجد میں اس غرض کے لیے کمرے بنوائے گئے چنانچہ چند سال اس مسجد میں درس وتدریس کے حلقے جمتے رہے۔ آخر میں طے پایا کہ مدرسہ کی اپنی مستقل عمارت ہونی چاہیے جہاں روئیداد مدرسہ ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) کے مطابق "ایک مکان وسیع، با فراغت، جس میں قریب سو کے طلبہ باآرام تمام رہ سکیں، اور چار پانچ درسگاہیں بھی ہوں، اور دفع حوائج ضروریہ کی جگہ بھی اس میں ہو، تیار ہو۔" چنانچہ نئی عمارت کے لیے چندہ کی اپیل کی گئی اور عطیات اور چندہ بھیجنے کے لیے سید محمد عابد ہی کا نام دیا گیا، یہ اپیل کامیاب رہی اور "آرزو دیرینہ جس کی سال ہا سال سے امید تھی .... ایک قطعہ نہایت واسطے تعمیر مکانات کے خرید لیا گیا۔" مدرسہ کی روئیداد ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) میں کہا گیا ہے کہ مدرسہ میں تقسیم اسناد کا رسمی اجلاس منعقد ہوا، جس میں دیوبند سے باہر کے لوگ بھی شریک تھے۔ اس موقع پر مدرسہ کی اپنی مستقل عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا:

"اول پتھر بنیاد کا جناب مولانا احمد علی صاحب سہارن پوری نے اپنے دست مبارک سے رکھا اور بعد میں جناب مولانا محمد قاسم و مولوی رشید احمد صاحب، مولانا مولوی محمد مظہر صاحب نے ایک ایک اینٹ رکھی۔" (۷)

گویا قیام مدرسہ کے تقریباً ۹ سال بعد مدرسہ کی اپنی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ مدرسہ کی عمارت سے متعلق ارباب مدرسہ کی جدوجہد کا ذکر مدرسہ ہی کی شائع کردہ سالانہ رپورٹوں میں ملتا ہے۔ جدید عمارت کے لیے چندہ کی اپیل، عطیات کے لیے سید محمد عابد کا نام، زمین کی خرید بنام حاجی صاحب غرضیکہ یہ ساری باتیں مدرسہ کی سالانہ رپورٹوں ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء)، ۱۲۸۹ھ (۱۸۷۲ء) میں درج ہیں۔ نیز سید عابد صاحب کے سوانح حیات تذکرہ العابدین میں، جو سید صاحب اور مدرسہ کے بارے میں قدیم مستند دستاویز شمار ہوتی ہیں، جدید عمارت کا تذکرہ موجود ہے جو مدرسہ کی سالانہ روئیدادوں سے مختلف نہیں۔ لیکن "ارواح

ثلاثہ" میں کہا گیا ہے، کہ جدید عمارت کی پہلی اینٹ مولانا اصغر حسین کے نانا مرحوم نے رکھی۔ نیز یہ کہ حاجی سید عابد صاحب، نئی عمارت بنانے کے خلاف تھے۔ وہ ناراض ہو کر چھتہ مسجد میں چلے گئے۔ لیکن مولانا محمد قاسم کی درخواست پر نہ صرف تقریب میں شریک ہوئے، بلکہ اپنی غلطی کا اعتراف کر کے معذرت بھی پیش کی۔ (۸)

واقعہ یہ ہے کہ "ارواح ثلاثہ" میں خوش اعتقادی نے بعض واقعات کو افسانہ بنا دیا ہے۔ ورنہ یہ بات محتاج بیان نہیں کہ مدرسہ کی اپنی شائع کردہ رپورٹوں اور "تذکرۃ العابدین" کے مقابلے میں ارواح ثلاثہ کی روایات کوئی وزن نہیں رکھتیں۔ یہ امر موجب حیرت ہے کہ میاں سید محمد میاں جیسے فاضل آدمی نے بھی انہیں صحیح تسلیم کر لیا۔ مثلاً مولانا محمد قاسم صاحب کے ذکر میں مولانا محمد میاں فرماتے ہیں:

> "اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دارالعلوم کے پر شوکت تصور سے حضرت حاجی صاحب کا ذہن خالی تھا۔ جس مقدس بزرگ نے معمولی مکتب کے خاکے پر دارالعلوم جیسی عظیم الشان تجویز کی بنیاد رکھی، وہ حجت الاسلام مولانا محمد قاسم صاحب کی ذات گرامی تھی۔" (۹)

سوال یہ ہے کہ اگر حاجی صاحب کے ذہن میں مدرسہ نہیں، مکتب کا تصور تھا تو پھر حاجی صاحب دلی کی درسگاہوں کی بربادی پر افسوس کیوں کرتے؟ اور یہ کیوں لکھتے کہ مدرسہ کا قیام عمل میں نہ آیا تو دینی مسائل اور احکام بتانے والا کوئی نہیں ملے گا۔ کیا مکتب کا قیام دینی مسائل کی تحقیق کے لیے ناکافی تھا؟ اگر حاجی صاحب نئی عمارت کی تعمیر کے خلاف ہوتے تو پھر نئی عمارت کے لیے چندہ کی اپیل اور انہی کے نام پر زمین خریدنے کا اعلان کیوں کیا جاتا؟ تذکرۃ العابدین میں نئی عمارت کی تعمیر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جب اہل شوریٰ نے مدرسہ کی مستقل عمارت بنانے کا تذکرہ کیا، تو حاجی صاحب نے کہا کہ یہ بات پہلے سوچنی چاہیے تھی تا کہ جامع مسجد میں جس پر اس عہد میں ڈیڑھ لاکھ روپے صرف ہوئے تھے، مزید کمرے نہ بنوائے جاتے۔ اہل شوریٰ حاجی صاحب کا جواب سن کر خاموش ہو گئے اور بعد میں مولانا محمد قاسم نے حاجی صاحب سے معذرت کی کہ "مجھ کو معلوم نہیں تھا کہ اہل شوریٰ نے آپ سے پہلے ذکر نہیں کیا اور خفیہ طور سے مشورہ کیا ہے، میں معافی چاہتا ہوں۔" لیکن ایک مدت کے بعد

> "ایک روز حاجی صاحب کو خود خیال آیا اور اہل شوریٰ سے کہا کہ مدرسہ علیحدہ بنانا چاہیے، اور مدرسہ کے واسطے جگہ خریدنی چاہیے۔ اہل شوریٰ نے کہا کہ اگر آپ

کی رائے ہے تو بہت بہتر ہے۔ مگر آپ ہی جگہ تجویز کر کے خرید فرمائیے۔ چند روز کے بعد حاجی صاحب نے جگہ تجویز کر کے خرید کی کہ جس کا بیعانہ بھی حاجی صاحب کے نام ہے۔ مولوی رفیع الدین صاحب جو کہ مہتمم مدرسہ تھے' اہتمام سپرد کیا' جو کہ بفضلہ تعالیٰ آج ایک لاکھ روپیہ کی تعمیر کا مدرسہ بنا رہے ہیں۔" (۱۰)

یہ ہے مدرسہ کی نئی عمارت بنانے کا واقعہ' اس لیے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جدید عمارت کا سنگ بنیاد مولانا احمد علی سہارن پوری نے رکھا' نیز یہ کہ نئی عمارت کے بنوانے میں حاجی صاحب نے حسب روایت نمایاں طور پر حصہ لیا۔ یہاں پر ارواح ثلاثہ کی ایک دوسری روایت کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔ ارواح کی ایک روایت میں آیا ہے کہ دہلی میں نجف خان نے شاہ ولی اللہ کے پہنچے اتروا دیے تھے تا کہ کوئی کتاب نہ لکھ سکیں اور شاہ عبد العزیز اور شاہ رفیع الدین کو دہلی سے جلا وطن کر دیا تھا۔ اس روایت کو مولانا گیلانی نے تذکرہ شاہ ولی اللہؒ میں' مولانا محمد میاں نے علمائے ہند کا شاندار ماضی' (ترجمہ شاہ عبد العزیز) میں نقل کیا ہے۔ ارواح کی یہ روایت بھی دوسری روایات کی طرح بے بنیاد ہے۔ کیونکہ نجف خان' شاہ ولی اللہ کے انتقال کے بعد دہلی میں آیا ہے۔ اس نے ۱۷۸۲ء میں وفات پائی' اس وقت تک شاہ عبد العزیز نے اپنی کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" تصنیف نہیں کی تھی۔ (۱۱) غرضیکہ مدرسہ کی اپنی سالانہ رپورٹوں اور مدرسہ سے متعلق قدیم ماخذ کو چھوڑ کر ارواح ثلاثہ کی روایات کو تحقیق و تنقید کے بغیر قبول کرنا مناسب نہیں۔ چنانچہ مولانا محمد میاں صاحب کی اس رائے سے اتفاق کرنا مشکل ہے کہ حاجی محمد عابد' مدرسہ کی نئی عمارت بنانے کے خلاف تھے' یا ان کے ذہن میں مدرسہ نہیں مکتب کا تصور تھا' حالانکہ دیوبند میں پہلے سے مکتب بھی موجود تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا محمد قاسم کی اپنی مستقل حیثیت ہے' جو اپنے بے داغ کردار اور پاکیزہ سیرت کی بناء پر ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے۔ اس سے اظہار عقیدت کے لیے نہ تو تاریخی حقائق کا انکار ضروری ہے اور نہ ہی سید محمد عابد کی پاکیزہ شخصیت کو نظر انداز کرنا یا اس کے وقار کو مجروح کرنا ضروری ہے۔ مقام مسرت ہے کہ علماء دیوبند نے اب اس حقیقت کا اعتراف کر لیا ہے کہ دارالعلوم کے اصل بانی حاجی سید محمد عابد ہیں' مولانا محمد قاسم نہیں جو قیام مدرسہ کے وقت ہی نہیں' اس کے بعد بھی کئی سال تک میرٹھ میں قیام پذیر رہے۔ (۱۲) یہاں پر یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ مولوی ذوالفقار صاحب نے' جن کا نام مدرسہ کی پہلی رپورٹ میں مدرسہ کے مہتممان میں درج ہے' مدرسہ پر ایک کتابچہ "الهدية السنية فی ذکر المدرسة الاسلامية" کے نام سے حاجی صاحب کی زندگی ہی میں

شائع کیا جس میں انہوں نے دل کھول کر حاجی صاحب کی شخصیت کو خراج ادا کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے بہ الہام خداوندی مدرسہ کے قیام کے لیے اہل خیر سے امداد کی اپیل کی۔ اس کتابچہ میں انہوں نے مولانا محمد قاسم کا ذکر بھی عقیدت واحترام سے کیا ہے۔ ان تمام شواہد و دلائل کے پیش نظر اس امر سے مجال انکار نہیں کہ دارالعلوم کے بانی جو شروع میں "مدرسہ عربی اسلامی" نام سے معروف تھا' حاجی محمد عابدؒ ہیں' مولانا محمد قاسم نہیں۔

مدرسہ کی ایک سالانہ رپورٹ ۱۲۸۳ھ (۱۸۷۰ء) سے پتہ چلتا ہے کہ ابتداء میں مدرسہ کا نصاب تعلیم دس سال پر مشتمل تھا' اس میں وہی نصاب پڑھایا جا رہا تھا' جو دہلی یا لکھنؤ کے مدارس میں درس نظامی کے نام سے رائج تھا۔ لیکن دو سال کے بعد (۱۲۸۵ھ) مدرسہ کی ایک کمیٹی نے نصاب کی مدت' دس سال کی بجائے چھ سال مقرر کر دی اور نصاب سے فارسی کتابوں کے علاوہ منطق و فلسفہ کی پرانی کتابیں بھی خارج کر دیں۔ البتہ فلسفہ میں "میبذی" داخل نصاب رہی۔ یہ نصاب مختصر ہونے کے باوجود اسلامیات کی تعلیم کے لیے کافی تھا۔ اس نصاب میں مختصر مضامین کے لیے مندرجہ ذیل کتابیں مقرر تھیں:

۱۔ تفسیر:	بیضاوی
۲۔ حدیث:	صحاح ستہ
۳۔ فقہ:	ہدایہ
۴۔ اصول فقہ:	توضیح تلویح
۵۔ عربی ادب:	مقامات حریری' کلیلہ ودمنہ' دیوان حماسہ' دیوان متنبی
۶۔ فلسفہ:	میبذی
۷۔ منطق:	ایساغوجی' قال اقول' مرقات' تہذیب' قطبی' میر قطبی
۸۔ تاریخ:	تاریخ یمینی

اس چھ سالہ نصاب میں عربی ادب کی کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا گیلانی نے لکھا ہے کہ ان کتابوں کو داخل نصاب کرنے سے مولانا محمد قاسم کا مقصد جدید تعلیم یافتہ گروہ کو مطمئن کرنا تھا جو کہتا تھا کہ انگریزی سکولوں کے طالب علم' انگریزی بولنا اور لکھنا جانتے ہیں' جب کہ درس نظامی کے فارغ التحصیل طلبہ نہ تو عربی زبان بول سکتے ہیں اور نہ ہی لکھ سکتے ہیں۔ (۱۳) مولانا گیلانی نے عربی ادب کی کتابوں کو داخل نصاب کرنے کی جو توجیہ یا علت بیان کی ہے' وہ ہمارے نزدیک محل نظر ہے۔ اس لیے کہ مولانا محمد قاسم اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ قرآن و سنت سے معارف واسرار کا سراغ لگانے کے لیے عربی زبان پر عبور حاصل

کرنا بنیادی شرط ہے اور یہ عبور عربی ادب اور اساتذہ فن کے کلام کو پڑھے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ اگر جدید گروہ ہی کو مطمئن کرنا مقصود ہوتا جیسا کہ مولانا گیلانی فرماتے ہیں، تو پھر مولانا محمد قاسم، نصاب میں عربی ادب کا نہیں بلکہ جدید مضامین کا اضافہ کرتے۔ واقعہ یہ ہے کہ عربی ادب، نصاب تعلیم کا ہمیشہ سے اہم حصہ رہا ہے۔ اس لیے مولانا قاسم نے اس روایت کو ترک کرنا مناسب نہیں جانا۔

درس نظامی کی مدت کو کم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ایک طالب علم مدرسہ سے فارغ ہو کر سرکاری مدارس میں جا کر اپنی علمی صلاحیتوں کو اجاگر کر سکے۔ مولانا نانوتوی نے اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا: "اس کے بعد (مدرسہ میں دینی تعلیم کے بعد) اگر طلبہ مدرسہ ہذا، مدارس سرکاری میں جا کر علوم جدیدہ کو حاصل کریں، تو ان کے کمال میں بات زیادہ موثر ثابت ہوگی۔" ہم پہلے یہ کہہ چکے ہیں کہ بانیان مدرسہ نئی تعلیم کے خلاف نہیں تھے بلکہ وہ تو اسے، جیسا کہ مولانا نے کہا ہے، علمی صلاحیتوں کو صیقل کرنے کے لیے ضروری گردانتے تھے۔ لیکن مولانا کی یہ آرزو پوری نہیں ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف دارالعلوم کے پڑھے ہوئے لوگ نئی دانش گاہوں میں نہیں گئے، بلکہ دس سالہ نصاب کو سبک بنانے کے لیے منطق کی جو کتابیں خارج کی گئی تھیں، انہیں پھر ۱۳۹۰ھ میں واپس لایا گیا کیونکہ منطقی علماء چھ سالہ دینی نصاب کے فارغ التحصیل طالب علموں کو عالم ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ دارالعلوم کے نصاب کو سطحی قرار دیتے کیونکہ ان کی رائے میں منطق کی کتابوں اور ان کے حواشی کی ورق گردانی کے بغیر "علم پختہ" نہیں ہوتا تھا۔" [۱۴] چنانچہ منطق و فلسفہ کی ساری کتابیں، مثلاً ملا حسن، حمد اللہ، قاضی مبارک، صدرا، شمس بازغہ اور دوسری کتابیں نصاب میں داخل کی گئیں، اور نصاب کی مدت چھ سال سے بڑھا کر آٹھ سال کر دی گئی۔

نئے علوم سے متعلق نہ صرف مولانا کی آرزو پوری نہیں ہوئی، بلکہ نصاب تعلیم کو بیرونی دباؤ کے پیش نظر پھر بوجھل بنا دیا گیا۔ ہماری رائے یہ ہے کہ مولانا کے جانشینوں نے کبھی بھی سنجیدگی سے مولانا کے علمی افکار کو موضوع بحث نہیں بنایا اور نہ ہی ان کی علمی تمناؤں کو بروئے کار لانے کے لیے کوئی قدم اٹھایا۔ مولانا گیلانی کا خیال ہے کہ مولانا محمد قاسم کی وفات سے یہ خواب حقیقت نہ بن سکا اور دارالعلوم کے طالب علم بہ قول مولانا گیلانی چند نفسیاتی وجوہ کی بناء پر سرکاری مدارس میں نہ جا سکے۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ مولانا محمد قاسم، اپنی اس تقریر کے بعد چار سال تک زندہ رہے۔ اس لیے اس تجویز کی ناکامی کی ذمہ داری ان کی موت پر مشکل ہی سے ڈالی جا سکتی ہے۔ اصل بات یہ ہے

کہ مولانا اور ان کے ساتھیوں نے اپنے عہد میں رائج نصاب تعلیم کو اختیار کیا اور پھر دو سال کے بعد اس نصاب میں کمی کر دی تا کہ طالب علم جدید علوم سے فائدہ اٹھا سکیں۔ لیکن انہوں نے خود اپنے ہاں جدید علوم کو پڑھانے کے لیے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا' اس لیے کہ ان کی رائے میں ایک ہی وقت میں دو علوم کو پڑھانا سودمند نہ تھا۔ چنانچہ مولانا نے نہ تو اپنے نصاب میں علوم جدیدہ کو داخل کیا اور نہ ہی قدامت پسند حلقوں کی دل پسند فلسفیانہ و منطقیانہ کتابوں کو نصاب میں جگہ دی۔ کیونکہ یہ دونوں چیزیں اصل مقصد کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے خوب سوچ سمجھ کر ایک راہ اختیار کی اور پھر اس پر وہ استقامت کے ساتھ چلتے رہے اور جس رائے کو صحیح سمجھا' اس کا اظہار کرتے رہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے عہد کے عام "مذہبی خیالات" کا لحاظ کیے بغیر علماء کی محفل میں علوم جدیدہ کی حمایت میں تقریر کی' اگر وہ علوم جدیدہ کو شامل نصاب کرنے کے حق میں ہوتے تو وہ یقیناً انتہا پسند حلقوں کی مخالفت کی پرواہ کیے بغیر انگریزی زبان اور دوسرے معاشرتی علوم کو نصاب میں جگہ دیتے' لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ اس طریق سے ان کے اصل مقصد (قدیم ورثے کا تحفظ) کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ البتہ انہوں نے وقت کے معقولی مولویوں کے غیر سنجیدہ اور معاندانہ رویہ کے پیش نظر منطق کی خارج شدہ کتابوں کو دوبارہ نصاب میں شامل کر لیا جس سے غالبا ان کا مقصد مدرسہ اور اہل مدرسہ کو تنگ نظر علماء کے عناد اور اس کے برے اثرات سے بچانا تھا۔

مولانا کی وفات کے بعد تو ساری کتابیں نصاب کا حصہ بن گئیں۔ مولانا رشید احمد گنگوہی منطق و فلسفہ کے خلاف تھے' اور فرمایا کرتے : "اس منطق و فلسفہ سے تو انگریزی بہتر ہے کہ اس سے دنیا کے نفع کی تو امید ہے۔" چنانچہ مولانا گنگوہی کے زمانہ میں چند سال منطق و فلسفہ کی کتابیں نصاب سے خارج رہیں' لیکن داخلی اور خارجی دباؤ اس قدر شدید تھا کہ خارج شدہ کتابیں دوبارہ نصاب تعلیم کا حصہ بنیں' اور ۱۳۱۰ھ (۱۸۹۳ء) میں درس نظامی اپنی پہلی صورت میں جنم لے کر واپس آگیا۔ درس نظامی کو اس کی پہلی صورت میں قبول کرنے اور نئے علوم سے مکمل اجتناب سے جو نتائج برآمد ہوئے' اس پر مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

> "لیکن مولویت کا اس زمانہ میں جو ماحول تھا' اس نے پھر مجبور کیا اور نکلی ہوئی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے میں لوگ پھر وقت ضائع کرتے رہے اور آج تک اضاعت اوقات کا وہی سلسلہ جاری ہے ..... لیکن واضح اسباب جن کی وجہ سے آپ (مولانا محمد

قاسم) کا تعلیمی نصب العین بروئے کار نہ آسکا اور قدیم و جدید علوم والسنہ کے پیوند و گرہ اندازی کی جو مہم آپ سر کرنا چاہتے تھے، افسوس ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا نظام تعلیم، مان لینا چاہیے، کہ اس وقت تک اس کے سر کرنے میں ناکام رہا ہے۔" (۱۵)

موجودہ وقت میں دارالعلوم میں آٹھ سالہ نصاب پڑھایا جا رہا ہے۔ اس میں تقریباً وہی کتابیں داخل ہیں جو ۱۲۹۰ھ (۱۸۷۴ء) میں پڑھائی جا رہی تھیں۔ اس نصاب کی تکمیل پر طالب علم کو "عالم" (۱۶) کی سند دی جاتی ہے۔ اس نصاب کی فہرست یہ ہے:

صرف:	میزان الصرف، منشعب، پنج گنج، علم الصیغہ، فصول اکبری، مراح الارواح
نحو:	نحو میر، شرح مأۃ عامل، ہدایت النحو، کافیہ، شرح جامی
عربی ادب:	مفید الطالبین، نخبۃ الیمن، مقامات حریری
منطق:	صغریٰ، کبریٰ، مرقات، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، سلم العلوم، ملاحسن
فلسفہ:	ہدیہ سعیدیہ، میبذی
فقہ:	نور الایضاح، قدوری، کنز الدقائق شرح وقایہ ہدایہ اولین، ہدایہ آخرین
اصول فقہ:	اصول الشاشی، نور الانوار، حسامی، توضیح تلویح
علم بیان:	مختصر معانی، تلخیص المفتاح
علم کلام:	مسامرۃ، شرح عقائد نسفی
ہیئت:	تصریح
علم الفرائض:	سراجی، اصول افتاء، رسم المفتی
اصول تفسیر:	الفوز الکبیر
اصول حدیث:	شرح نخبۃ الفکر
حدیث:	مشکوۃ شریف، صحاح ستہ (صحیح بخاری، صحیح مسلم، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، نسائی) موطا امام مالک، موطا امام محمد، شمائل ترمذی

اس نصاب کی تکمیل کے بعد اگر طالب علم مزید ایک سال قیام کرے اور تفسیر کی دو کتابوں: تفسیر ابن کثیر اور تفسیر بیضاوی کو مکمل پڑھ لے تو اسے "فاضل" کی سند دی جاتی

ہے۔ لیکن اگر وہ درجہ فضیلت کے بعد مزید دو سال علمی سفر جاری رکھے تو اسے "کامل" کی سند سے نوازا جاتا ہے۔ ان اسناد کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، جامعہ ازہر قاہرہ نے تسلیم کر لیا ہے۔ ان اسناد میں جو عربی زبان میں ہوتی ہیں، نہ صرف پڑھی ہوئی کتابوں کا اندراج ہوتا ہے، بلکہ ان میں طالب علم کی ذہنی استعداد، علمی مہارت اور اخلاقی حالت کا بھی ذکر ہوتا ہے چونکہ طالب علم اپنی علمی استعداد اور اخلاقی حالت کے اعتبار سے مختلف مقامات رکھتا ہے، اس لیے یہ اسناد بھی ادنیٰ، متوسط، اعلیٰ درجات رکھتی ہیں۔ درجہ تکمیل میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل نصاب ہیں:

ادب	دیوان حماسہ، دیوان متنبی، معلقات سبعہ (کلاسیکی شاعری کا شہرہ آفاق کلام)
عروض	نقطہ الدائرۃ
معانی	مطول
منطق	میر زاہد، رسالہ میر زاہد، ملا جلال، حمد اللہ، قاضی مبارک
فلسفہ	صدرا، شمس بازغہ
علم کلام	خیالی، امور عامہ، جلالی
مناظرہ	رشیدیہ
اصول فقہ	مسلم الثبوت
ریاضی	خلاصہ الحساب، اقلیدس
ہیئت	شرح چغمینی، سبع شداد
حکمت شرعیہ:	حجتہ اللہ البالغہ، عوارف المعارف (۱۷)

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ دارالعلوم میں ہر طالب علم کو نہ صرف تعلیمی سال کے اختتام پر، جو ماہ رجب میں ختم ہو جاتا ہے، امتحان میں بیٹھنا پڑتا ہے بلکہ سہ ماہی اور شش ماہی امتحانات سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ یہ امتحانات بڑے نظم وضبط کے ساتھ لیے جاتے ہیں، جن میں نقل یا دھوکہ دہی کے واقعات کا ظہور میں آنا تقریباً ناممکن ہے۔ چونکہ امتحان میں پاس ہونے کے لیے کم از کم ساٹھ فیصد نمبروں کا حصول ضروری ہے، درجہ دوئم (سیکنڈ ڈویژن) اور درجہ اول (فرسٹ ڈویژن) حاصل کرنے کے لیے طالب علم کو کم از کم ۷۴ اور ۸۸ فیصد (بالترتیب) نمبروں کی ضرورت ہے۔ البتہ پہلے اور دوسرے سال کے طالب علم سے صرف زبانی امتحان (سوال۔ جواب) لیا جاتا ہے۔

ہرچند امتحانات کا طریقہ برصغیر کی بعض ریاستوں میں (مثلاً بیجاپور) رائج تھا لیکن ایک

وقت کے بعد یہ طریقہ کم از کم شمالی ہندوستان میں متروک ہو چکا تھا۔ ایسے ہی شمالی ہندوستان کے مدارس میں طالب علموں کی درجہ بندی اور حاضری کا اہتمام بھی نہیں تھا۔ دارالعلوم نے اپنے طریق تعلیم میں امتحانات، طالب علموں کی درجہ بندی اور حاضری وغیرہ سے متعلق امور کو اختیار کر کے طالب علم کی علمی استعداد کو مضبوط بنانے کا سروسامان مہیا کر دیا۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ دارالعلوم میں داخل ہونے کے لیے بھی امتحان شرط ہے جس میں اکثر امیدوار ناکام ہو جاتے ہیں اور داخلہ سے محروم۔ چنانچہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جب طالب علم دارالعلوم کے نصاب کو مکمل کر کے فارغ ہوتا ہے تو وہ علمی میدان میں پورے اعتماد سے داخل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دارالعلوم کے طریق تعلیم کی ان تمام خوبیوں کے باوجود ہم یہ کہنے کی جسارت کریں گے کہ:

طلبہ کی فکری اور علمی ارتقاء کے لیے مولانا محمد قاسم نے جو خواب دیکھا تھا، وہ بوجوہ پورا نہ ہو سکا جس پر مولانا گیلانی نے مسلمانوں کے بخت واژگوں اور تقدیر کو ذمہ دار قرار دیا ہے۔ نصاب تعلیم کے بنیادی سقم پر دارالعلوم کے ایک دوسرے فاضل ہمدرد ڈاکٹر ضیاء الحسن فاروقی فرماتے ہیں:

"یہ بدقسمتی ہی تھی کہ مسلمان فلسفیوں کی خالص فکری کاوشوں کے باوجود فلسفیانہ فکر کی کوئی روایت قائم نہ کی جا سکی۔ فلسفہ پر قدامت پسندی کی فتح، فکری جمود پر منتج ہوئی۔ جس نے مسلمانوں کے دانشمندوں کی ساری تخلیقی صلاحیتوں کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ صحیح بات یہ ہے کہ ملا صدرا اور شمس بازغہ جیسی کتابیں پڑھنے والوں کے دلوں میں سنجیدہ عقلی سوچ بچار کی تڑپ یا لگن پیدا نہ کر سکیں، اس امر سے بھی مجال انکار نہیں کہ دارالعلوم کی صفوں سے فلسفے کو نکال باہر کرنا یا نصاب میں چند فرسودہ فلسفیانہ رسائل کا ابن سینا، فارابی اور ابن رشد کی کلاسیکی کتابوں کے لیے جگہ نہ چھوڑنا، ایک ایسا رجعت پسندانہ قدم ہے، جس نے اجتہاد کے دروازے کو عملی طور پر بند کر دیا۔ بہرنوع تقلید کے فطری جمود کا پھر بھی شکریہ کہ اس کی وساطت سے (پرانے) فلسفے نے دارالعلوم میں اپنی روایتی جگہ کو واپس لے لیا، واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم میں کسی صحت مند جدت کی روایت کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ منطق اور فلسفے میں تمام روایتی کتابوں کو جو درس نظامی کا حصہ ہیں، نصاب میں شامل کیا گیا۔ ایک آدمی یہ دیکھ کر واقعی حیران رہ جاتا ہے کہ آج بھی دارالعلوم کے نصاب میں امام غزالی کی تہافت الفلاسفہ اور شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ داخل نہیں ہے۔" (۱۸)

ڈاکٹر فاروقی کے ٹھوس تبصرہ سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو، یہ امر واقعی قابل حیرت

ہے کہ عبد الکریم القشیری، غزالی اور ابن عربی میں سے کسی کی کتاب کو نصاب میں جگہ نہ مل سکی حالانکہ تصوف اور اہل تصوف سے اہل دیوبند کو فکری اور جذباتی طور پر ہمیشہ گہرا تعلق رہا ہے۔ مزید یہ کہ خود شاہ ولی اللہ کے عہد میں یا ان سے قبل رائج نصاب میں تصوف کی متعدد کتابوں کے (عوارف المعارف، نقد النصوص، النعرف) نام ملتے ہیں۔ شاہ صاحب نے اپنے سوانح میں اپنے درسیات کی جو فہرست دی ہے، وہ موجودہ درس نظامی کے مقابلے میں مختصر اور سبک ہے۔

نحو:	کافیہ، شرح جامی
منطق:	شرح شمسیہ، شرح مطالعہ
فلسفہ:	شرح ہدایت الحکمہ
کلام:	شرح عقائد نسفی
فقہ:	شرح وقایہ، ہدایہ
اصول فقہ:	حسامی
بلاغت:	مختصر، مطول
حدیث:	ترمذی، مشکوۃ، صحیح بخاری
تفسیر:	مدارک، بیضاوی

درس و تدریس اور تصنیف و تالیف شاہ صاحب کا وظیفہ حیات تھا، چنانچہ وہ ایک جگہ اپنے تجربہ تعلیم کے بارے میں لکھتے ہیں:

"طریق تعلیم (جس کی صحت) تجربہ سے پایہ تحقیق کو پہنچ چکی ہے، یہ ہے کہ سب سے پہلے صرف و نحو کے مختصر رسائل، تین تین یا چار چار، طالب علم کی ذہنی استعداد کے مطابق پڑھائے جائیں، اس کے بعد تاریخ یا حکمت عملی کی کوئی کتاب، جو عربی زبان میں ہو، اسی وقت میں استاد طالب علم کو کتب لغت سے استفادہ کرنے اور ان کے مشکل مقامات کو حاصل کرنے کے طریق سے بھی آگاہ کرے۔ جب اسے (طالب علم) عربی زبان پر قدرت حاصل ہو جائے، موطا امام مالک بروایت یحییٰ بن یحییٰ مصمودی پڑھائی جائے، اسے (موطا کی تدریس) کسی صورت میں ترک نہ کیا جائے، یہ علم حدیث کی اساس ہے ..... اس کے بعد قرآن عظیم بکمال زور دیں، اس طور پر کہ تفسیر کے بغیر صرف قرآن با ترجمہ پڑھا جائے اور جہاں کوئی نحو یا شان نزول کا مشکل سوال آجائے تو وہاں توقف کریں اور (اسے حل کرنے کے لیے) بحث کریں، اس کے

بعد تفسیر جلالین کا درس ہو' اسی قدر جتنا کہ قرآن مجید کا درس ہوا ہے۔ اس طرح پڑھنے میں بڑے فائدے ہیں۔ اس کے بعد ایک وقت میں حدیث کی کتابیں' مثلاً صحیح بخاری' صحیح مسلم وغیرہ اور فقہ' عقائد اور سلوک (تصوف و اخلاق) کی کتابیں پڑھائیں اور دوسرے وقت میں کتب دانشمندی' مثلاً شرح ملا اور قطبی' اگر ممکن ہو تو طالب علم ایک دن مشکوۃ پڑھے' دوسرے دن اس کی شرح ٹیبی' اسی قدر جس قدر پہلے دن مشکوۃ پڑھی تھی' یہ طریق نہایت نفع بخش ہے۔" (۱۹)

حضرت شاہ صاحب نے اپنے درسیات کی جو فہرست دی ہے' تقریباً" اسی قسم کا سبک نصاب تعلیم مولانا محمد قاسم نے شروع میں اختیار کیا تھا' جس کا ان کے معاصر معقولی مولوی مذاق اڑاتے تھے۔ شاہ صاحب کے علاوہ شاہ عبد العزیز نے اپنے ملفوظات میں درس تصوف میں لوائح' لمعات' شرح لمعات' درہ فاخرہ اور فتوح الغیب جیسی کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے علمی خاندان سے دارالعلوم کو جو قلبی تعلق ہے' وہ سب پر عیاں ہے۔ دارالعلوم نہ صرف اپنے آپ کو شاہ صاحب کی علمی وراثت کا جانشیں گردانتا ہے' بلکہ اسے یہ بھی دعویٰ ہے کہ افکار قاسمی دراصل ولی اللہی فکر و حکمت کی بہترین شرح ہیں۔ لیکن شاہ صاحب سے یہ گہری عقیدت' شاہ صاحب کی کتابوں کو نصاب تعلیم میں جگہ نہ دلوا سکی۔ درس نظامی پر برصغیر کے اہل علم (۲۰) نے جو تبصرے کیے ہیں' یا اس پر نظر ثانی کرنے کے لیے جو تجاویز پیش ہوتی رہی ہیں' ان کے بارے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ ان افکار و آراء کی صدائے بازگشت تھیں' جن کا اظہار جمعہ ازہر کی اصلاح کے سلسلہ میں کیا گیا۔ مثلاً" یہ کہا گیا کہ نصاب تعلیم میں علامہ سعد تفتازانی اور سید میر کی تالیفات فنی نقطہ نظر سے مفید نہیں ہیں۔ مصری علماء کا خیال ہے کہ تیمور لنگ کے عہد میں تفتازانی اور سید میر کو سرکاری طور پر جو عروج حاصل ہوا' تو انہوں نے اپنے استاد عضد الدین' صاحب مواقف کے طریق تدریس اور کتابی علم کو فروغ دیا جس سے علم کو نقصان پہنچا۔ اس بات کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے کہ جب محی الدین محمد سلیمان' جو نحو کی کتاب "الکافیہ" کی کثرت تدریس کی وجہ سے "الکافجی" کے نام سے معروف تھے' مصر میں آئے تو سرکاری سطح پر ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی جس کی وجہ سے علماء ان کے قرب کو ضروری گردانتے۔ کافجی کو الفاظ کی گرہ کشائی اور علوم نقلیہ میں فلسفیانہ اسلوب کی بھونڈی پیروی پر بڑا ناز تھا۔ جلال الدین سیوطی ان سے ملنے گئے تو انہوں نے سیوطی سے کہا کہ "زید قائم" میں ایک سو تیس بحثیں ہیں۔ (۲۱) اس قسم کی ابحاث اور لفظی موشگافیوں میں عمر کا ضیاع تو ہوتا رہا اور فریب

خوردہ شاہیں سراب کو حقیقت جانتا رہا' لیکن نہ تو دینی ذوق پیدا ہوا کہ اصلی سرمایہ حیات ہے اور نہ ہی عربی ذوق' جو قرآن فہمی کا ایک بنیادی سرچشمہ ہے۔ ابوالکلام آزاد نے سچ کہا تھا کہ چند کتابوں کے علم اور نفس علم میں بڑا فرق ہے۔ غرضیکہ یہ نصاب تدریس علمائے مصر کی نظر میں عربی ذوق کو بگاڑنے کا موجب بنا۔ کہتے ہیں کہ جب اموی خلیفہ یزید بن ولید نے خلیفہ بننے کا اعلان کیا' تو اسے پتہ چلا کہ مروان بن محمد نے اس کی بیعت نہیں کی ہے' اور وہ اس بارے میں تردد و تذبذب کا شکار ہے' اس لیے کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا۔ اس پر یزید نے مروان کو لکھا: میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں ہماری بیعت پر تردد ہے۔ جب تمہیں میرا یہ خط ملے تو تم جو بھی قدم اٹھانا چاہو' اٹھاؤ۔ والسلام

یزید بن ولید نے مروان کی اس ذہنی کیفیت کو کہ وہ بیعت کے بارے میں تذبذب کا شکار تھا اور کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا تھا' عربی کی عبارت "تقدم رجلا وتوخر اخری" سے تعبیر کیا جس کا لفظی ترجمہ ہے "تم ایک قدم آگے بڑھاتے ہو تو دوسرا پیچھے" خطیب قزوینی نے اسے تلخیص میں نقل کرنے کے بعد اس کی شرح میں جو بے مقصد اور مہمل موشگافیاں کی ہیں' اس پر عبد المتعال صعیدی نے لکھا ہے کہ چونکہ وہ عبد القاہر کی بجائے سکاکی' سعد (تفتازانی) اور سید میر (جرجانی) سے متاثر تھا' اس لیے عربی ذوق سے محروم رہا۔ چنانچہ وہ عربی کے اس صاف اور واضح اسلوب کو سمجھ نہ سکا اور اس بات پر وقت ضائع کیا کہ مروان واقعی ایک قدم آگے اٹھاتا تھا' کیا اسی قدم کو پیچھے لے جاتا تھا اور اس قسم کی سقیم اور بے معنی تشریحات کی ہیں۔ (۲۲)

غرض جامعہ ازہر میں صلاح کی کوششیں برابر جاری رہیں۔ گزشتہ صدی کے آخر میں شیخ الازہر شیخ انبابی نے ایک فتویٰ میں کہا کہ علوم ریاضی کی' جیسے حساب' ہندسہ' طبعیات وغیرہ' تعلیم جائز ہے۔ اگر کسی علم کے پڑھنے پر کوئی دنیاوی یا دینی مصلحت موقوف ہو' تو پھر اس علم کا پڑھنا واجب ہے۔ مثلاً علم طب۔ شیخ انبابی نے اپنے فتویٰ میں امام غزالی کا سہارا لیا کہ انہوں نے احیاء علوم الدین میں ان علوم کو جائز قرار دیا ہے۔ لیکن جب شیخ محمد عبدہ نے انبابی سے مقدمہ ابن خلدون کو داخل نصاب کرنے کے لیے کہا تو انبابی نے جواب دیا کہ ایسا کرنا ہماری روایت کے خلاف ہوگا۔ (۲۳)

جامع ازہر کی اصلاح کے لیے شیخ عبدہ نے اپنی رپورٹ لکھی' جس پر انہیں وقت کے علمائے جامد کا ہدف ملام بننا پڑا۔ لیکن عبدہ کا علمی مقام' عربی زبان پر گہرا رسوخ اور ہجوم مشکلات میں ان کا صبر و استقلال' بالآخر وقتی شورشوں اور معاندانہ ہنگاموں پر غالب آیا اور

جہل و تعصب کو فکر و نظر کے لیے اپنی جگہ چھوڑنی پڑی۔ جامعہ ازہر میں ان اصلاحات سے پہلے ازہر پر ایک عام علمی و اخلاقی انحطاط طاری تھا' جس کے خلاف آواز اٹھانا' گویا دین کے خلاف آواز اٹھانا تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن مصر میں جمال الدین افغانی کی آمد نے افکار میں آگ لگا دی اور اس کی مسیحا نفسی نے شیوخ کے غرور نفس اور جمود طبع کو توڑ دیا اور محمد عبدہ جیسے آدمی کو اصلاح کے لیے کھڑا کیا' ورنہ جامع ازہر کی علمی و فکری ابتری' مسلمانوں کے عام انحطاط و زوال کی علامت تھی۔ مولانا شبلی کو' جو گزشتہ صدی کے آخر میں مشرق وسطیٰ کے ملکوں کی سیر کرتے ہوئے مصر پہنچے تھے' جامع ازہر کی اخلاقی ویرانی اور علمی ابتری دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ اور انہوں نے نہایت ہی رنج و الم سے اس کا تذکرہ اپنے سفر نامہ روم میں کیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ دارالعلوم کے نصاب تعلیم کو بہتر' موثر اور ٹھوس بنانے کے لیے خود دارالعلوم کے فاضل حضرات ہی ایک مدت سے سوچ بچار کر رہے ہیں۔ مولانا گیلانی کی یہ رائے یقیناً غور طلب ہے کہ مسلمانوں کو نصاب تعلیم میں اپنی تاریخی وحدت کو واپس لانا چاہیے۔ دین اور دنیا کی تفریق نے مسٹر اور ملا کا جو جھگڑا پیدا کیا ہے' اس سے نجات حاصل کرنا ازبس ضروری ہے۔ مولانا ایک جگہ فرماتے ہیں: "دینیات کی کل تین کتابوں (مشکوۃ' ہدایہ' وقایہ) کے سوا ملائیت کا سارا میدان غیر دینیاتی کتابوں سے بھرا ہوا محسوس ہوا' تو حقیقت یہ ہے کہ اسی وقت سے میں اپنے اندر اس یقین کو پاتا ہوں کہ اسی میدان کو قدیم مطالبے والے غیر دینی علوم کو نکال کر باآسانی موجودہ مطالبوں کے مطابق مضامین کے لیے پوری قوت اور کافی وسعت دلی کے ساتھ ہم جگہ نکال سکتے ہیں۔" (۲۴) خود دارالعلوم کے اندر "مولانا حسین احمد مدنیؒ کے آخری زمانے میں پھر نصاب پر نظر ثانی کی تحریک شروع ہوئی اور دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے باضابطہ ایک کمیٹی کی اس مقصد کے لیے تشکیل کی۔ اس کمیٹی نے نصاب میں ترمیمات کیں اور قدیم علوم عقلیہ کو کم کر کے انگریزی اور علوم جدیدہ کو اس میں شامل کرنے کی سفارش کی مگر بعض وجوہ سے حضرت (مدنی) رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی میں اس کمیٹی کی سفارشات پر عمل نہ ہو سکا۔ تاہم اس کی ضرورت برابر محسوس کی جاتی رہی۔" (۲۵)

مقام مسرت ہے کہ دارالعلوم کے فاضل حضرات کو نہ صرف وقت کے تقاضوں کا احساس ہے بلکہ وہ اپنے حالیہ نصاب تعلیم کے نتائج سے بھی خوش نہیں ہیں۔ قاضی زین العابدین سجاد اس افسوس ناک صورت حال کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اکثر حالات میں نہ طلبہ (عربی مدارس) عربی زبان سے واقف ہوتے ہیں، نہ دینی مسائل سے، نہ قرآن کا ترجمہ کر سکتے ہیں، نہ حدیث کو سمجھ سکتے ہیں مگر ان کو ایک طویل وعریض سند حوالے کر دی جاتی ہے، جسے بعض حالات میں وہ پڑھ کر بھی نہیں سنا سکتے اور وہ بھی مرکزی دینی مدارس کے اکابر علماء کے دست مبارک سے۔" (۲۶)

قاضی صاحب موصوف نے تعلیمی انحطاط پر جو تبصرہ کیا ہے، تقریباً یہی بات دارالعلوم کے ایک دوسرے بزرگ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے کہی ہے۔ فرماتے ہیں:

"علوم دینیہ کی تعلیم کے لیے جو کتابیں اور جس ترتیب سے رکھی گئی ہیں، وہ مقصد کے حصول کے لیے کافی نہیں ہیں۔ پھر ان کا جو طریق تعلیم ہے، وہ بھی ناقص ہے۔ طالب علم کا واسطہ کتاب سے رہتا ہے، فن سے نہیں۔ علوم آلیہ میں (صرف، نحو، معانی، بیان و بلاغت وغیرہ) اس سلسلہ میں دو قسم کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ایک طریق تعلیم میں اور دوسری کتب درسیہ میں۔ اول الذکر میں اس لیے کہ ہمارے طلبہ عربی ادب میں مقامات، سبعہ معلقہ اور دیوان متنبی وغیرہ پڑھ جانے کے باوجود عربی زبان میں نہ لکھ سکتے ہیں اور نہ بول سکتے ہیں۔ اب رہیں کتب درسیہ، تو ظاہر ہے کہ عربی ادب میں اب بہتر سے بہتر کتابیں یا ان کے منتخبات چھپ کر آگئے ہیں۔"

غرضیکہ اس صدی کے آغاز میں درس نظامی پر نظر ثانی کے لیے جو باتیں شبلی، ابوالکلام آزاد اور دوسرے علماء نے کہی تھیں، اب انہیں تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں اس سلسلہ میں مولانا آزاد نے ایک کمیٹی بنائی تھی، جس میں مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا حفظ الرحمٰن، ڈاکٹر عبد العلیم، مولانا سید سلیمان ندوی اور ایک شیعہ عالم شریک تھے۔ اس کمیٹی نے بھی جدید نصاب تیار کیا تھا جس میں مسلمانوں کی تعلیمی، اقتصادی اور فلسفیانہ کاوشوں کے ساتھ دور حاضر کا فلسفہ بھی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ درس نظامی میں اصلاح یا دوہرے نظام تعلیم کو ختم کرنے کے لیے اب تک جو مساعی کی گئی ہیں، ان سب میں یہ نصاب ٹھوس، مربوط اور جامع تھا۔ اس نصاب کو وقت کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ (۲۷) خود ابوالکلام نے ۱۹۴۷ء میں لکھنؤ کانفرنس میں (جس میں علماء اور ماہرین تعلیم شریک تھے) اپنی ایک معروف تقریر میں درس نظامی پر تبصرہ کرتے ہوئے ہر فن اور اس کی کتابوں کا جائزہ لیا تھا، جس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے نصاب تعلیم اور جامع ازہر کے اصلاحی پروگرام کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اپنی تقریر کے آخر میں فرماتے ہیں:

"افسوس! درس نظامی ہماری ضروریات کی ہرگز کفایت نہیں کرتا۔ ہم معقولات کی تعلیم میں ساری دنیا سے ڈیڑھ سو برس پیچھے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ اس ورثہ کو محفوظ رکھیں اور اس کی عظمت کو قائم رکھیں لیکن ہمیں زمانہ کی رفتار کو پیش نظر رکھنا ہی پڑے گا۔

زمانہ سے قدامت پسندی ہمیشہ لڑتی رہی ہے۔ قدامت پرستی نے جب ہتھیار اٹھایا تو کشمکش ضرور ہوئی، مگر قدامت پسندی ہاری اور وقت جیتا۔ ہم وقت سے نہیں لڑ سکتے۔ آپ کہیں گے کہ پہلے بھی تو لوگ یہی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہ سچ ہے لیکن اس وقت زمانہ ۱۹۴۷ء کا نہیں تھا، اس وقت تعلیم و زمانہ میں رشتہ تھا۔ اس کے بعد زمانہ پوری رفتاری سے چلتا رہا اور ہم بیٹھے رہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ آپ نصاب تعلیم کی از سرنو تشکیل کریں اور زمانہ کے رخ کو پہچان کر آگے بڑھیں۔"

یہاں پر یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ درس نظامی پر نظر ثانی کا یہ مقصد نہیں ہے کہ دینیات کے طلبہ نیچرل سائنس میں مثلاً طبعیات، کیمسٹری، انجینئرنگ، علم طب، ماہر بن کر نکلیں۔ قدیم نصاب تعلیم پر نظر ثانی کا مفہوم یہ ہے کہ طالب علم اپنے ہی فن میں ماہر بنے اور اسے علم ہو کہ اس کے فن میں یعنی مذہب، علم کلام، تاریخ اور فلسفہ میں انسانی فکر نے انسان کے لیے کیا سرمایہ فراہم کر دیا ہے۔ نیز یہ کہ عربی زبان پر عبور حاصل ہو۔ اگر صرف، نحو یا ادب میں ایسی کتابیں موجود ہیں، جو مروجہ نصابی کتابوں سے زیادہ مفید ہیں اور تجربہ نے ان کی افادیت کی تصدیق بھی کر دی ہے، تو پھر ان کتابوں کو داخل نصاب کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ یہی بات طریق تعلیم کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ ایسے ہی اگر ہمارے اسلاف نے اپنے زمانہ کے مغربی علوم (یونانی فکر) کو اپنے نصاب کا حصہ بنایا تھا، تو آج بھی مغربی علوم کو (فلسفہ، تاریخ، سیاست، علم دینیات) نصاب کا حصہ بنایا جا سکتا ہے، تاکہ ہمارا طالب علم تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اپنے موضوع پر پورے اعتماد اور وثوق سے بات چیت کر سکے اور دوسروں تک پیغام پہنچا سکے۔ اس لیے ہماری یہ رائے ہے کہ اگر دارالعلوم اپنے ابتدائی اور ثانوی نصاب میں جدید سرکاری مدارس کے مضامین کو بھی جذب کر لے، تو اس کے طالب علم کالجوں میں داخلہ لے سکتے ہیں اور یہ طالب علم آگے چل کر اپنی دینی اور مذہبی تعلیم و تربیت کی وجہ سے امتیازی شان کے مالک ہوں گے۔ لیکن جو طلبہ دینیات ہی میں اعلیٰ تعلیم جاری رکھنا چاہیں تو ان کے لیے دارالعلوم اپنے نصاب میں علم سیاست، معاشیات اور تاریخ میں جدید ابحاث کو بھی شامل کر لے۔ برطانیہ اور امریکہ

کی معروف دانش گاہوں میں دینیات کے مستقل ادارے قائم ہیں، جن میں علم کلام، بائبل کی تفسیر و تشریح، عیسائی مجددین کی تاریخ، غرضیکہ فلسفہ مذہب کے تمام پہلو، پوری قوت اور دیدہ ریزی سے پڑھائے جاتے ہیں۔ یہی طالب علم آگے چل کر دنیا میں کلیسا کی عظیم الشان منظم تحریک کو نیا خون فراہم کرتے ہیں۔ شبلی مرحوم نے ایک دفعہ ہندوؤں کے مذہبی مدارس گروکل کے بارے میں کہا تھا کہ ان مدارس میں استاد اور طالب علم دونوں انتہائی محنت، ریاضت اور عزم سے کام کر رہے ہیں اور اپنے نصاب میں نہ صرف انگریزی زبان بلکہ اسلام کو بھی رکھا ہے۔ دارالعلوم نے، جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، بعض کمیٹیاں بھی بنائیں جو بہ وجوہ اپنے کام کو آگے نہ بڑھا سکیں۔ اس لیے اگر وہ از سرنو ماہرین تعلیم کی کمیٹی کی تشکیل کرے، جو اس موضوع پر مبسوط، مربوط اور ٹھوس رپورٹ تیار کرے اور پھر اس رپورٹ کی روشنی میں دارالعلوم اپنے ہاں نصاب تعلیم اور طریق تعلیم کے خدوخال متعین کرے تو یہ امر بڑے ہی دور رس خوشگوار نتائج پر منتج ہوگا اور اس طریق سے وہ حاجی سید محمد عابد، مولانا محمد قاسم اور ان کے ساتھیوں کی مقدس تمناؤں کی صحیح ترجمانی کر سکے گا۔

ماخذ اور حواشی

۱۔ دیوبند اسکول اور مطالبہ پاکستان، کتاب دراصل فاضل مولف کا ایک تحقیقی مقالہ ہے جسے انہوں نے میگل یونیورسٹی کے لیے لکھا تھا۔ نیز ملاحظہ ہو: مولانا محمد طیب صاحبؒ، دار العلوم دیوبند کی صد سالہ زندگی۔ مولانا سید محمد میاں: علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے ج ۱۔ مولانا مناظر احسن گیلانی، سوانح مولانا محمد قاسم نانوتوی، ہر چند کتاب کا موضوع مولانا نانوتوی کی ذات گرامی ہے لیکن دار العلوم کی بنیاد، نصاب تعلیم اور دوسرے مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں۔ سید محبوب رضوی: تاریخ دار العلوم دیوبند (مقدمہ از قاری محمد طیب) بابرا منکاف: برطانوی ہند میں اسلام کی احیاء: دیوبند، طبع پرنسٹن یونیورسٹی امریکہ، ۱۹۸۲ء

۲۔ آئین اکبری، ج ۱، ص ۵۲۴ (کلکتہ ایڈیشن) ابو الفضل کے الفاظ یہ ہیں: قلعہ از خشت پختہ دارد۔ نیز ملاحظہ ہو گزیٹر، سہارن پور، ج ۲، ص ۴۲۴۔ سید محبوب رضوی: تاریخ دیوبند

۳۔ محمد نذیر احمد: تذکرۃ العابدین، امداد العارفین ص ۶۸

۴۔ ایضاً: ۶۸، ۶۹

۵۔ محمد طیب : دار العلوم دیوبند، ص ۱۷، ۱۸

۶۔ ندوۃ العلماء، رپورٹ ۱۹۱۲ء، ص ۱۰۹، ۱۱۰

۷۔ روئداد مدرسہ دیوبند ۱۲۹۲ھ بحوالہ سوانح قاسمی، ج ۲، ص ۳۲۵۔ تاریخ دیوبند ص ۳۷۷

۸۔ اشرف علی تھانوی، مولانا : حکایت اولیاء (ارواح ثلاثہ) ص ۲۳۰۔ یہ روایت مرحوم قاری محمد طیب نے اپنے والد مرحوم کے حوالہ سے بیان کی ہے لیکن مولانا تھانوی نے حاشیہ پر تذکرۃ العابدین کی روایت نقل کر دی ہے کہ معذرت حاجی عابد حسین نے نہیں بلکہ مولانا محمد قاسم نے پیش کی تھی۔

۹۔ علمائے حق ج ۱، ص ۶۷، ۶۸

۱۰۔ تذکرۃ العابدین ص ۷۳

۱۱۔ برہان، دہلی، نومبر ۱۹۶۴ء (شاہ ولی اللہ اور شاہ عبد العزیز سے متعلق چند غلط روایات، از محمد عضد الدین خان)

۱۲۔ عزیز الرحمان (مفتی) تذکرہ مشائخ دیوبند ص ۱۶۸

۱۳۔ سوانح قاسمی ج ، ص ۲۸۱

۱۴۔ مرحوم نواب حبیب الرحمان شروانی نے اسی سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ لکھا ہے کہ ندوۃ العلماء کے ایک اجلاس میں درس نظامی سے منطق کے رسالہ ایساغوجی کو خارج کرنے کی تجویز پیش کی گئی تو "اس مسئلہ پر (بہ قول شروانی صاحب) تین دن بحث ہوتی رہی، علماء کی اکثریت یہ کہہ رہی تھی کہ اگر "ایساغوجی" کو نصاب سے خارج کیا گیا تو اس سے علم کی بنیاد ہی اکھڑ جائے گی" (سوانح قاسمی ۲ / ۲۹۹۔ حاشیہ)

۱۵۔ سوانح قاسمی، ج ۲، ص ۲۹۳، ۲۹۴

۱۶۔ دار العلوم دیوبند، ص ۴۹۔ لیکن تاریخ دار العلوم میں اسی سند کو "الفاضل" کا نام دیا گیا ہے، ملاحظہ ہو ج ۲، ص ۲۷۵، ۳۰۱

۱۷۔ دار العلوم دیوبند ص ۳۵، ۴۹۔ تاریخ دار العلوم دیوبند، ج ۲، ص ۲۷۰، ۲۷۴۔ دار العلوم دیوبند (از نفیر الدین) ص ۱۳، ۱۶۔ مقام مسرت ہے کہ نصاب میں بعض نئی مفید کتابیں بھی شامل کر لی گئی ہیں مثلاً سال دوئم میں نحو کی کتاب "النحو الواضح" سال سوئم میں تاریخ ہند، تاریخ اسلام، فن بلاغت میں البلاغۃ الواضحۃ،

عربی ادب میں برائے مطالعہ احمد امین کی "حیاتی" طہ حسین کی "الایام" عباس محمود عقاد کی "عبقریات" مقدمہ ابن خلدون جیسی کتابیں رکھ دی گئی ہیں جن پر ہم دار العلوم کے ارباب حل وعقد کو تہہ دل سے مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

۱۸۔ دیوبند اسکول، ص ۳۲، ۳۳

۱۹۔ التفہیمات الالہیۃ، ص ۲۹۵ (تحقیق غلام مصطفیٰ قاسمی) پروفیسر محمد سرورؒ نے بھی ارمغان شاہ ولی اللہ میں اس وصیت نامہ کو نقل کیا ہے۔

۲۰۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ شبلی نعمانی (رحمہ اللہ) کو درس نظامی اور اسلام کے کلاسیکی ادب پر عبور حاصل تھا۔ چنانچہ مولانا مرحوم نے ایک ماہر فن کی حیثیت سے لکھا، درس نظامی کے بارے میں مولانا رحمہ اللہ لکھتے ہیں: یہ امر خاص طور پر اظہار کے قابل ہے کہ آج جس چیز کو لوگ درس نظامی کہتے ہیں اور اس نام کی وجہ سے سختی کے ساتھ اس پر اڑے ہوئے ہیں، اس کا بڑا حصہ درس نظامی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا مثلاً حمد اللہ، ملا حسن آج درس نظامی میں داخل ہیں، یہ کتابیں ملا نظام الدین کے زمانہ میں تصنیف بھی نہیں ہوئی تھیں، قاضی مبارک درس میں داخل نہ تھی۔ ..... متعدد کتابیں جو اس وقت درس میں داخل تھیں، وہ اب اڑا دی گئیں ..... اسی طرح انہوں (ملا نظام الدینؒ) نے فن موسیقی کو بھی داخل درس رکھا ہے۔

۲۱۔ تاریخ الاصلاح فی الازہر، ص ۲۴۶، ۲۴۷

۲۲۔ ایضاً ص ۲۷۲، ۲۷۳

۲۳۔ ایضاً ص ۴۳

۲۴۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، ص ۳۲۳، ۳۲۴

۲۵۔ زین العابدین سجادؒ: "ہندوستان کے عربی مدارس اور ان کے نصاب تعلیم پر ایک نظر" در مجلہ "اسلام اور عصر جدید" دہلی، جنوری ۱۹۷۰ء، ص ۴۱۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۱۹۲۸ء میں دار العلوم نے اعلان کیا تھا کہ فلسفہ کی جدید کتابوں کو داخل درس کیا جائے گا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ملاحظہ ہو "القاسم" دار العلوم نمبر، دیوبند، محرم ۱۳۴۷ھ، ص ۴

۲۶۔ اسلام اور عصر جدید، جنوری ۱۹۷۰ء، ص ۴۴

۲۷۔ عابد رضا بیدار نے "ہندوستانی مسلمانوں کی ریفارم کے مسائل" میں لکھا ہے کہ اس مجوزہ نصاب کا ایک نسخہ رام پور لائبریری میں محفوظ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ

مولانا مرحوم اپنی علمی اور سیاسی مصروفیتوں کے باوجود مسلمانوں کے قدیم نظام تعلیم پر برابر غور و فکر کرتے رہے۔ انہوں نے "تذکرہ" میں کھل کر درس نظامی پر تنقید کی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ۱۹۱۶ء میں جدید نصاب کی تدوین بھی کی اور اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات کا جائزہ بھی لیا۔ ہمارے علماء کرام اور ماہرین تعلیم کو ان دونوں رپورٹوں کا (رپورٹ ۱۹۱۶ء جو کلکتہ کے شعبہ تعلیم میں شاید محفوظ ہو، جیسا کہ مرحوم غلام رسول مہر نے "تبرکات آزاد" میں لکھا ہے اور رام پور لائبریری میں محفوظ رپورٹ ۱۹۴۷ء) جائزہ لینا چاہیے۔

(بہ شکریہ "المعارف" لاہور)

مذہب کے مطالعہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ آپ اس کی تاریخ، اس کی شخصیات، اس کے احکام اور اس کے رسوم و رواج کا مطالعہ کریں۔ یہ گویا اشیاء مذہب کا مطالعہ کرنا ہے۔ اس پہلو سے مذہب میں بھی موضوعی معلومات دستیاب ہیں۔ اس لیے یہاں مذہب کا مطالعہ بھی ٹھیک اسی طرح براہ راست شواہد کی بنیاد پر کیا جا سکتا ہے جس طرح حیاتیاتی ارتقاء میں کیا جاتا ہے۔

مذہب کے مطالعہ کا دوسرا پہلو وہ ہے جس کو عام طور پر غیبیات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ وہ عقائد ہیں جو ہماری محسوس دنیا سے ماورا ہیں۔ یعنی خدا اور فرشتوں کا وجود، وحی کی حقیقت، جنت اور دوزخ کا عقیدہ وغیرہ۔ مذہب کے اس دوسرے پہلو میں براہ راست شواہد موجود نہیں ہیں۔ اس لیے اس اعتبار سے مذہب کا مطالعہ اس منطقی اصول کی روشنی میں کیا جائے گا جس کو شواہد کی بنیاد پر استنباط کہا جاتا ہے۔ اس تجزیہ کی روشنی میں دیکھئے تو مذہب اور سائنس دونوں کا معاملہ بالکل یکساں ہے۔ دونوں ہی میں دو الگ الگ حصے ہیں۔ ایک حصہ وہ ہے جو علمی قطعیت پر قائم ہے اور جس میں براہ راست استدلال ممکن ہوتا ہے۔ دوسرا حصہ وہ جو علمی استنباط پر مبنی ہے اور جس کو ثابت کرنے کے لیے صرف بالواسطہ استدلال کا اصول استعمال کیا جاتا ہے۔ اس علمی تقسیم کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو دونوں میں کوئی فرق نظر نہیں آئے گا۔

(مولانا وحید الدین خان)